علمائے برصغیر اور مطالعۂ مسیحیت

مولانا محمد احسن گیلانی - ۲

[زیرِ نظر مقالے کی پہلی قسط کے لیے "عالمِ اسلام اور عیسائیت" کا شمارہ بابت نومبر ۱۹۹۵ء ملاحظہ کیجیے۔ مدیر]

ان کل مباحث سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی توجہ اسلام کے ان جزئی مسائل کی طرف منعطف ہوئی ہے جن سے یورپ کی ساختہ پرداختہ جدید ذہنیت و عقلیت کو خواہ مخواہ دکھ پہنچتا ہے، یا پہنچ سکتا ہے۔ ان تمام مباحث میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ دو باتوں کا التزام کیا ہے۔

(۱) یورپ کے ۸۰ فیصد باشندے جس مذہب کو اپنی زندگی کا آئین و دین بنائے ہوئے ہیں، اُسی پر جینا اور اُسی پر مرنا چاہتے ہیں، خود اس مذہب میں ان مسائل کے متعلق کس قسم کے احکام اور معلومات ہیں، اس سے بڑا مقصد آپ کا اُن پادریوں اور باشندگان یورپ کو شرم دلانا ہے جو اسلام پر منہ آتے ہیں، حالانکہ وہ ساری نکتہ چینیاں خود اس دین پر ایک ایک کر کے منطبق ہیں۔ جسے انھوں نے اپنا دین بنا رکھا ہے، اس قسم کی باتوں کے بعد آپ نے لکھا ہے، اور بجا لکھا ہوا ہے کہ "وہی حضرت عیسیٰ کی بات پوری ہوئی کہ اپنی آنکھ کی شہتیر نہیں دیکھتے ہو، اور بیگانہ کی آنکھ کا تنکا دیکھتے ہو۔"

(۲) جن مسائل کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہو، کہ انسانی عقل و فطرت پر وہ گراں ہیں، گرانی کا یہ افسانہ آیا واقعی ہے یا صرف یورپ کے منہ زوروں، قلم کے چالاک دستوں، کلیسیاء کے دشمنوں کے انتہا پسند گروہ کے فقط شور و غوغا، جدل و مشاغبہ سے یہ وہم پیدا ہو گیا ہے؟

آپ نے ہر ایسے سوال کو جہاں تک اس زمانہ میں رسائی ممکن تھی، اٹھایا ہے، اور ان ہی دونوں اصول کے ماتحت سب کے ایسے جوابات دیے ہیں کہ بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ایک بڑا کارآمد اور قیمتی حصہ اس کتاب میں آ گیا ہے، نمونہ کے لیے چند مسائل کا ذکر کرتا ہوں۔

اس ذیل میں آپ نے مسئلہ تقدیر، جسمانی دوزخ اور جنت، تعدد ازدواج رسول اللہ ﷺ، ایمان و عمل کے تدرج، اور ان کے امتیازات، حقیقتِ عبادات، قانونِ مغفرت کی تشریح، زمین کے قطبی علاقے

جہاں دن رات مہینوں دراز ہو جاتے ہیں، وہاں نماز و روزہ کی ادائی کی شکل، ذوالقرنین کے قرآنی قصہ میں آفتاب کے چشمہ میں غروب ہونے کی نوعیت، مسئلہ نسخ ادیان، مسئلہ جہاد کی حقیقت، اسلام اور تلوار کا تعلق، قانون قتل مرتد، اشاعت اسلام کے اسباب، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں اصولی فرق، آنحضرت ﷺ کے متعلق بائبل کی پیشین گوئیاں، خود آنحضرت ﷺ کی وہ پیشین گوئیاں جو اُس وقت تک پوری ہوتی جائیں گی، آپ کے معجزات وغیرہ۔

تعارف و تبصرہ کے کسی مضمون میں مشکل ہے، کہ ان تمام مباحث کا استقصاء کیا جائے، جو اس کتاب میں درج ہیں، تاہم بطور نمونہ کتاب کی چند اہم باتوں سے ناظرین کو محروم رکھنا بھی ایک ظلم ہے۔

مسئلہ تقدیر

حسب دستور اس مسئلہ کے متعلق مغربی مذاہب یعنی یہودیت و نصرانیت کی مستند کتابوں سے ان شہادتوں کا انبار لگا دیا ہے، جن سے مسئلہ تقدیر ثابت ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا کون سا مذہب یا دھرم ایسا ہے جس میں فطرت کے اس اٹل قانون کی تعلیم نہیں دی گئی ہے، پھر تحقیقی طور پر اس مسئلہ کی تقریر کی ہے، فرماتے ہیں۔

> آیتوں اور حدیثوں کے جمع کرنے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تقدیر کا مسئلہ اور دوسرے یہ کہ آدمیوں کے افعال بہ مشیت الٰہی ظہور میں آتے ہیں۔

آپ نے ان دونوں مسئلوں کو الگ الگ مسئلہ قرار دیا ہے پہلے مسئلہ تقدیر کتنے صاف اور واضح لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

> سو تقدیر کے معنی ہمارے اصول میں یہ ہیں، کہ جو کچھ عالم ظہور میں نمودار ہوتا ہے، منجملہ جواہر ہو، خواہ منجملہ اعراض، سب کا انداز ظہور کا یعنی یہ کہ کیا؟ کون؟ کیسا؟ کتنا؟ اور کب؟ وغیرہ لوازم ظہور ازل سے خداوند تعالیٰ کے علم میں داخل ہے، کہ سر مو اس کے خلاف ظہور میں نہیں آسکتا ہے، اور جو چیز جس انداز سے ظاہر ہوتی ہے، وہ خداوند تعالیٰ کے سابقہ علم ازلی سے باہر نہیں ہو سکتی، جو کچھ اسے معلوم ہے، اس کا ظہور اوس کی نسبت ہوتا ہے، یعنی اگر وہ چاہتا ہے، تو ظاہر ہوتا ہے، اور اگر نہیں چاہتا تو نہیں ظاہر ہوتا۔

گویا آپ کے نزدیک تقدیر کا منکر وہی ہو سکتا ہے، جو عالم کو بجائے خدائے علام الغیوب کے مادہ اور اور اس کے قوانین کا مظہر سمجھتا ہے، یا جو سمجھتے ہیں کہ خدا نے عالم کو بغیر کسی سابقہ پروگرام کے بنایا ہے، ان کے نزدیک اپنے لفظوں میں "خدا غیر مال اندیش ٹھہرے گا"۔

یعنی کم از کم منکر تقدیر کے لیے یہ تو ناگزیر ہے کہ عالم اور اس کے نظام کو کسی غیر مال اندیش کا کارنامہ قرار دے، حالانکہ خدا اور "غیر مال اندیش" دونوں متضاد باتیں ہیں، اِس کے بعد دوسرے مسئلہ کی تشریح اِن لفظوں میں فرماتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ مشیت، سو ہمارے اصول میں اِس طرح پر ہے کہ معلومات حضرت حق جل و علا کا ظہور نہیں ہوتا، مگر بموجب اوس کے ارادے کے نہ کہ کسی اور کے ارادے سے۔

مطلب یہ ہے کہ جب افعالِ انسانی بھی معلوماتِ حق میں ہیں، اِس لیے اِن کا ظہور بھی بغیر ارادۂ حق کے نہیں ہوسکتا، لیکن پھر بالاتفاق انسان کو اپنے اعمال وافعال کا ذمہ دار فطرۃً، قانوناً، شرعاً کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اِس باریک مسئلہ کی توجیہ اِس طرح کرتے ہیں۔

اور جس چیز کو خداوند تعالیٰ نے عرصۂ ظہور میں ذی علم اور صاحبِ ارادہ بنایا ہے، مثلاً انسان کو سو اوس کے ارادے کے آثار نہیں متفرع ہوتے ہیں، اِس طرح پر کہ اِس میں ارادۂ الٰہی کو دخل نہ ہو۔

لیکن انسانی ارادہ کے ساتھ ارادۂ الٰہی کس طرح دخیل ہے، اِس کا حل محققانہ اور گہرے لفظوں میں پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

جس طرح انسان کی ہستی حدوثاً و بقاءً ہر آن حضرت وجود واجب کے فیض ارادی کی محتاج ہے، اسی طرح انسان کے خواص و لوازم کے آثار بھی حدوثاً و بقاءً اسی کے فیض کے محتاج ہیں، اور انسان جو مکلف بالشرع ہے، اسی ذی علم والارادہ ہونے سے اور اسی جہت سے مستحق ثواب وعذاب ہوا کرتا ہے۔

کم از کم میرے علم و تحقیق میں نہ صرف اردو بلکہ عربی کی بھی کسی کتاب میں اس ژولیدہ اور عمیق مسئلہ کی اتنی اچھی تعبیر نظر سے نہیں گزری، لیکن افسوس ہے، کہ آپ نے اجمال سے کام لیا ہے، خواص تو انشاء اللہ تعالیٰ اِس کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں گے، لیکن عوام کے لیے تشریح کی ضرورت تھی، --- خود مولانا اپنی اِس بحث کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

اگر اِس مسئلہ کی دقت کا لحاظ نہ ہوتا، تو بحول اللہ وقوتہ و بہ تصدق نعلین مقدسہ غلامانِ شاہنشاہ دو جہاں حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کے اِس مقام پر اِس کے ثبوت کی دلیلیں ایسے وضع پر لکھتا کہ سننے والوں کو خدا چاہتا تو مزا ملتا۔

اسلام اور تلوار

مسئلہ کا ذکر چھیڑتے ہوئے پہلے ایک تاریخی شہادت ادا کرتے ہیں۔

پادری لوگ عوام مسلمانوں اور اپنے تابعداروں اور ہندوؤں کو اکثر مسئلۂ جہاد کو بہ تقاریر

رنگا رنگ بیان کر کے دینِ اسلام سے بیزار کرتے ہیں، اور عجیب و غریب مغالطے دیا کرتے ہیں۔

آج ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے اندر "اسلام بزور شمشیر پھیلا" کا جو شور و غوغا ہے، اسلام کی سیاسی تاریخوں کے متعلق عام مسلمانوں کو کالجوں اور اسکولوں کے فتنہ انگیز گمراہ کن نصاب سے جو شکوہ ہے، ایک صد سالہ مؤرخ کی اس عینی شہادت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ یہ شوشہ ابتداءً کن لوگوں کا چھوڑا ہوا ہے۔ اس مغالطہ کے چہرہ پر ہسٹاریکل ریسرچ اور تحقیقات وغیرہ الفاظ کے غازے کس طرح ملے جا رہے ہیں، ہندوؤں اور انگریزوں کے تابعداروں کا خیال کر کے آپ نے اس مسئلہ کے متعلق خلافِ دستور علاوہ مغربی مذاہب (یہودیت و نصرانیت) کے مشرقی ادیان ہندو اور پارسی مذہب کی کتابوں سے بھی ان شہادتوں کو جمع کیا ہے، جس میں اس مسئلہ کا ذکر قانوناً و عملاً زور شور سے کیا گیا ہے، اور آخر میں بائبل کے ایسے دفعات مثلاً

> تم یہ سلوک کرو کہ ان کے مذبحوں کو ڈھا دو، اور اُن کے بتوں کو توڑ دو، ان کے باغوں کو کاٹ ڈالو، اور اُن کی تراشی ہوئی مورتوں کو آگ میں جلا دو۔ جتنی لڑکی ہیں، سب کو قتل کر دو --- لیکن وے لڑکیاں جو مرد کے ساتھ سونا نہیں جانتی ہیں، اُنہیں اپنے لیے رہنے دو۔

اس کے بعد آپ نے مسیحی یورپ سے یوں دریافت کیا ہے۔

> اس پر ہمارے یہاں کے مسئلہ جہاد پر ہنسنا کتنی ناانصافی ہے، اگر ملحد بے دین ہنسے تو ہنسے، عیسائیوں کو کوئی طعن کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

اس کے بعد اُنہوں نے پوچھا ہے کہ اسلام اور تلوار کے افسانے کو اس بلند آہنگی سے اچھالنے کا مقصد کیا ہے، اگر یہ غرض ہے کہ چونکہ اسلام تلوار سے پھیلا، اس لیے وہ باطل ہے، تو پھر اس کا دوسرا پہلو یہ پیدا ہوتا ہے، کہ جتنے خرافات، بدعادات، اوہام و رسوم جو دُنیا میں بغیر تلوار کی مدد کے پھیل جاتے ہیں، اور آئے دن پھیلتے رہتے ہیں، یہ سب حق و راست ہوں۔ فرماتے ہیں۔

> اگر یہی مطلب ہے تو محض جھوٹ ہے، کیونکہ اگر یہ بات سچ بھی جائے، تو چاہیے کہ اگلے عربوں کو بُت پرستی اور اسی طرح انگلستان کی بُت پرستیاں اور ہندوستان کی --- یہ سب مذہب حق ٹھہریں۔

ان جزئی اُمور کے ساتھ آپ نے نفس مسئلہ پر ایک ایسی دل نشین تقریر فرمائی ہے، جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ آپ کا مخصوص حصّہ ہے۔

مسئلہ جہاد کی نوعیّت

آپ کے خیال میں اسلامی جہاد کی ابتداء بھی تبلیغ سے ہوتی ہے، اور اس کی انتہاء بھی تبلیغ ہی پر ہے، البتہ تبلیغی آواز میں زور پہنچانے یا حق وصدق کا آزاد تجربہ کرانے کے لیے بسا اوقات ضرورت ہوتی ہے کہ اصلاحی آواز کے ساتھ جو قوم مخاطب کی جائے، وہ اپنی قومی سطوت، صنفی وجاہت کی انانیّت ونخوت کی آلایش سے پاک ہو، فرماتے ہیں۔

> باتفاق اہلِ تجربہ بدیہی الثبوت ہے کہ آدمی کو اپنے خلاف طبع بہ نسبت اُمور مخصوصہ اپنے صنف کے دوسرے کی بات نہ ماننے کا بڑا سبب اکثر اپنے صنف کی وجاہت اور سطوت واقع ہوا کرتا ہے، کہ اس وجاہت وسطوت کے سبب سے دوسرے غیر صنف کی بات پر کان دھرنے کو ننگ وعار جانتا ہے، چہ جائے کہ اس کو قبول کرنا، کہ یہ بات تو بہت دُور ہے، اور جب تک جی لگا کر سنے گا نہیں تو ماننے کی نوبت کاہے کو آئے گی۔

پھر جس طرح تجربی طور پر یہ ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ

> اپنے خلاف طبع امور مخصوصہ صنفیہ کی مخالف باتیں دوسرے کے کان رکھ کر سننا اوس کا بڑا باعث قوی، کوئی مثل غلبہ وجاہت اور سطوت صنفیہ اس کے کہنے والے کی بھی ہے۔

ان چند مقدمات کے بعد آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام کفر کے مقابلہ میں کرۂ زمین میں اگر اپنی سیاسی برتری کا خواہاں ہے، تو کیا تبلیغ ودعوت کی آواز کو موثر بنانے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے؟ باقی دشمنوں کا یہ مشہور کرنا کہ اسلام میں لوگوں کو بزورِ شمشیر مذہب بدلنے یا دوسرے لفظوں میں منافق بننے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس کی شدّت کے ساتھ تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> اگر کہیے کہ بعضے جبابرۂ ملوک اسلامیہ نے کسی جگہ بطور اکراہ کے شمشیر زنی کی تو اوّل اس کا ثبوت چاہیے، علاوہ بریں اگر کسی نے کی تو خال خال کہیں اتفاقیہ بر سبیل ندرت کی ہو، لہٰذا اس شمشیر زنی سے کچھ دین نہیں پھیلا، جیسا خلفائے راشدین اور اون کے تابعین بالاحسان کے ہاتھ سے پھیلا، پس جبابرہ کے اکراہ کرنے سے اصل دین باطل نہیں ہوتا۔

پھر سیاسی برتری حاصل کر لینے کے بعد اسلام اپنے فرض تبلیغ کو کس طرح ادا کرتا ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

> اور سطوت وفرمانروائی کی جہت سے دین کا پھیلنا دو طرح سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ اہلِ حکومت کی فروتنی اور مروّت وسخاوت، اور عدم تنگ گیری اور تہذیبِ اخلاق اور حسنِ اعمال اور زہد اور بزرگیاں باعث ہوتی ہیں، جیسا کہ ہمارے یہاں پہلے طبقہ والوں کے ہاتھ

سے ہوا، جوں جوں ان کے آثار کم ہوتے گئے، دین کی تریج کم ہوتی گئی۔

بعد کے خلفاء اور سلاطین نے جو قیصری و کسروی رنگ اختیار کر لیا تھا، اس پر افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے بعد اشاعت اسلام کا مرکز ثقل بجائے سلطنت کے زور کے بزرگوں کی روحانی و اخلاقی قوت کی طرف منتقل ہو گیا۔ فرماتے ہیں۔

گو کہ سطوت اور طمطراق ظاہری جبر و قہر مسلمانوں کا بڑھتا گیا، اور بعد اس زمانہ کے جو پھیلا تو اکثر بزرگوں کی کرامتوں سے پھیلا۔

بہرحال یوں مسئلہ جہاد کی ابتداء اور اس کی انتہاء دونوں آپ کے خیال میں تبلیغ و دعوت ہی پر ختم ہوتی ہے، اسلامی سیاست کے ان دونوں نتائج کو دکھانے کے بعد آخر میں آپ کی نگاہ مغربی سیاست کے اُن آثار و نتائج پر بھی پڑتی ہے جو محکوم قوموں میں سیاسی برتری کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن ان دونوں کے طریقۂ تاثر میں جو امتیازی فرق ہے، اُس کو چند لفظوں میں عجیب طرح سے ادا کرتے ہیں۔

دوسری طرح (یعنی تفوق کا اثر دوسری طرح یوں بھی) ہوتا ہے، کہ تنگی معاش رعایا، اور ترفع حکام، اور زر کشی حاکم کے باعث ہو۔

کیا آج مغربی سیاست کا یہ نظام کہ عام رعایا کی دولت کو مختلف ٹیکسوں، بلکہ عجیب و غریب ہتھکنڈوں سے اس طرح چوس لیا جائے، کہ وہ کبھی پنپنے نہ پائے، سول حکام عام رعایا سے اس طرح کنارہ کناں رہیں جس طرح آدمی جانوروں بلکہ ناپاک جانوروں سے دور دور رہتا ہے، اُس کے ساتھ ساتھ یہ آہنی قانون بھی نافذ کر دیا جائے، کہ ملک کا ہر وہ باشندہ جو مغربی تہذیب و تمدن کی بھاٹ خوان یونیورسٹیوں، اسکولوں کالجوں کی سند نہیں رکھتا، خواہ کسی دل و دماغ سلیقہ و قابلیت کا مالک کیوں نہ ہو، رزق کے وہ تمام دروازے عزت کے وہ تمام ابواب جو سلطنت نے کھول رکھے ہیں، اُس پر بند کر دیے جائیں گے۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس سسٹم کو آج مغربی سلطنتیں اپنی حکومت کے اندر سے نکال دیں، تو کیا رعایا کا کوئی فرد بھی ان کی تہذیب و تمدن و معاشرت اور عقلیت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے۔ اونچی اونچی لمبی دلکش و نظر فریب عمارتوں، قیمتی اور دیدہ زیب فرنیچروں کے اندر کروڑہا روپیہ کے مصارف سے ملک کے طول و عرض میں یہ کام ہو رہا ہے، لیکن شاید دس فی صد سے زیادہ آدمی بھی متاثر نہیں ہو سکے ہیں، اور وہ بھی جو ہو رہے ہیں، اُن کے متعلق مولانا بجا ارشاد فرماتے ہیں۔

سوائے ان لوگوں کے جو ننگے بھوکے بہت رہے، اور ابواب معیشت کے ان پر بند ہوئے۔

جزیہ

اس ذیل میں آپ نے جزیہ کا بھی ذکر کیا ہے، آپ کے نزدیک جزیہ حکومتوں کا انکم ٹیکس ہے، جو مسلمانوں کے اموال پر بڑی بھاری بھاری رقموں کی شکل میں زکوٰۃ و عشر کے نام سے عائد کیا جاتا ہے، لیکن غیر مسلموں پر اس ٹیکس کو نہایت حقیر رقم کی صورت میں اس لیے لگایا جاتا ہے، تاکہ دینے والے کو اپنے سیاسی صغر و حقارت کا احساس اور مسلمانوں کے سیاسی تفوق کا اندازہ ہوسکے، اور اسلام اپنی تبلیغی غرض کے لیے اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے، آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

> جو کسب و عمل کی طاقت نہ رکھتا ہو اُس سے کچھ بھی نہیں، پھر ملک کے جو باشندے کماتے کھاتے ہوں، تو مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی مغلوبیت کے اظہار کے لیے فی نفر چند روپیہ سالانہ حسبِ استطاعت حتیٰ کہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو (مثلاً راجہ مہراج نائب نواب کیوں نہ ہو) تو تیرہ روپیہ کئی آنہ سے زیادہ نہ ہو، مقرر کروالینا چاہیے۔

قطبِ شمالی و جنوبی میں نماز روزہ کی بحث

حسب دستور یورپ کے اس مشہور طفلانہ مغالطہ کے متعلق آپ نے پوچھا ہے، کہ کیا یہ سوال صرف اسلام کی نماز روزوں کے متعلق پیدا ہوتا ہے، آخر موقت پوجا پاٹ، نماز روزہ کس مذہب میں نہیں۔ خود یورپ کے مسیحی مذہب میں کیا نماز روزہ نہیں ہے اور اگرچہ اب نماز کی حقیقت عیسائیت میں صرف یہ رہ گئی ہو کہ

> آٹھویں روز بے طہارت ایک وقت یہ دعا مانگیں کہ "اے عیسیٰ ہمارے خدا پھر دنیا میں ظاہر ہو۔ مگر روزہ تو باتفاق اس کا نام تھا کہ دن بھر کے کھانے پینے اور عورت کی صحبت سے علیٰحدہ رہنا بہ تواتر ثابت ہے، کہ عیسائی بھی اس روزہ کو رکھتے تھے، سو دیکھیے کہ حوالی قطب والے کسی طرح عیسائی نہیں ہوسکتے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوگی، وہاں "آٹھ دن میں ایک وقت وغیرہ کے کیا معنی ہوسکتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب اس قسم کی وقتی عبادتوں کے متعلق جو جواب دیں گے، وہی اسلام دے گا، پھر اسلام کی طرف سے ایک محققانہ تقریر فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> ایسے اعتراضوں کا اصلی مادہ یہ ہے کہ تعمیل بعضے احکام شرعیہ میں بعض اوقات کچھ عذرات درپیش ہوجاتے ہیں، اور یہ بات کہ بروقت لاحق ہونے ان عذروں کے کیا کرنا چاہیے، ان حکموں کے ساتھ مفسّراً منصوص نہیں ہوتے، سو یہ معاملہ شریعت اسلامیہ ہی

میں نہیں ہے، بلکہ تورات و انجیل کے احکام میں بھی یہی حال ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں، ایک حوالی قطب کا عذر کیا ہے، ایسے عذر بکثرت ہوتے ہیں۔

مثلاً خوف حدوث مرض، یا شدّت مرض اور نقصان بدن، مثلاً اندھا ہونا اور سہو خطا یا نسیان اور فقدانِ مال اور افلاس شدید اور خوف دشمن یا رہزن وغیرہ از باب تعذرات۔

اس کے بعدہ کرۂ زمین کا آپ نے نقشہ بتایا ہے جس میں طول البلد، عرض البلد کے لحاظ سے دکھایا گیا ہے کہ آفتاب کی شعاعیں کن علاقوں میں کس طرح پر کتنی مدت تک پڑتی ہیں، اور سورج کی کرنوں کی ان مختلف نسبتوں کا اثر زمین کے کس قطر پر کیا مرتب ہوتا ہے، بحث کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور مبردہ (یعنی سرد علاقہ) اس حصّہ کو کہتے ہیں، جو ایک جانب جنوب و شمال میں دائرہ قطبیہ کے اندر ہے، اور دائرہ قطبیہ خط استواء سے ساڑھے چھیاسٹھ درجے یعنی ہمارے کوسوں کے حساب سے تخمیناً دو ہزار ایک سو اٹھائیس پر ہے، اور سب اہل جغرافیہ قدیم و جدید بالاتفاق لکھتے ہیں، کہ مبردہ حصوں پر شعاعیں آفتاب کی جب پڑتی ہیں، تو ایسی ترچھی پڑتی ہیں، جیسے ہمارے ملکوں میں جاڑوں میں تین چار گھڑی دن چڑھے تک پڑتی ہیں، سو اس جہت سے وہاں کا برف کبھی پانی نہیں ہونے پاتا ہے، بالجملہ ساڑھے چھیاسٹھ درجے سے پرے بلکہ وہاں تک بھی برف باری ایسی ہمیشہ برابر رہتی ہے کہ آدمی وہاں نہیں گھر بنا سکتا۔

لیکن اگر قسمت کا مارا کسی طرح ان علاقوں میں پہنچ جائے، تو یہ عذر کی صورت ہے، اور اسلام کا فتویٰ اس عذر کے پیش آجانے پر آپ کے نزدیک یہ ہے۔

وے لوگ جو ایسی جگہوں میں رہتے ہیں، دنوں اور راتوں کی چوبیس گھنٹوں پر تقسیم کر کے بارہ گھنٹے کی رات اور بارہ گھنٹے کا دن قرار دے کر نمازیں اپنی چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت کی ادا کریں۔

پھر روزے کے متعلق فرماتے ہیں۔

جواب اس کا بھی وہی ہے جو میں نے اوپر نمازوں کے ادا کرنے کی نسبت لکھا۔

پھر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی استثنائی شکلیں دنیا کے تمام قوانین و شرائع میں پیش آتی ہیں، لیکن

فرق اتنا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں از روے کسی حجّت کے منجملہ حجتہائے اربعہ اجمالاً، تفصیلاً اور کلیتہً یا جزیتہً کوئی نہ کوئی بات ایسی مقرر ہے کہ جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے، کہ بروقت پیش آنے والے ان عذروں کا کیا کرنا چاہیے، بخلاف تورات و انجیل

کے اس میں سے ایسا کچھ نہیں نکلتا۔

مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اس مسئلہ کا جواب جسے فقہ کی کتابوں سے مولانا نے نقل کیا ہے، اس کی بنیاد دجال کی اس مشہور حدیث پر مبنی ہے، جس میں پیشین گوئی کی گئی تھی، کہ ایک دن چالیس دنوں کے برابر ہو جائے گا، تو صحابہؓ کے یہ پوچھنے پر کہ نمازیں کس طرح پڑھی جائے گی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اندازہ کر لینا" مولانا نے اسی اندازہ کی تشریح کرتے ہوئے "دنوں اور راتوں کو چوبیس گھنٹوں پر تقسیم کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور اندازہ کی یہ بہترین شکل ہے۔

مضمون طویل ہوا جا رہا ہے اور کتاب کے لطائف ختم ہی ہونے کو نہیں آتے، خصوصاً یہ خیال کر کے کہ خدا جانے کتاب کی اشاعت کی نوبت آتی ہے یا نہیں، جی یہی چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کتاب کی نادر مفید باتیں اس مضمون کے ضمن میں آجائیں، لیکن مستقل رسالہ ہوا جاتا ہے، اس لیے صرف اسلامی "بہشت و دوزخ" کی بحث میں سے کتاب کے ایک فقرہ کو درج کر کے ناظرین کو اصل کتاب کی شروطباعت کا منتظر بناتے ہوئے مضمون کو ختم کر دیتا ہوں۔

اسلامی بہشت و دوزخ کا عقیدہ

جس طرح ہندو مذہب میں پاپی انسان کی اخروی سزا یہ سمجھی جاتی ہے کہ آدمی بجائے آدمی ہونے کے بیل یا گھوڑا، سور، بندر، ہو جاتا ہے، یعنی بقول کارلائل انسان کی غیر تشفی یافتہ فطرت سزا بھگتنے کے لیے تشفی یافتہ جانوروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ آدمی نیکیوں کی بدولت آدمی نہیں رہتا، بلکہ بجائے آدمی کے فرشتہ ہو جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کا انعام انسان کو اس شکل میں ملتا ہے کہ انسانیت کے تمام نازک احساسات، لطیف جذبات کچل کر برباد کر دیے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کے خیال میں جنتی آدمی اسی لنڈمنڈ غیر حساس زندہ وجود کا نام ہے، انجیل کی ایک آیت سے مسیحیوں کو یہ مغالطہ ہوا۔ کریلا نیم پر اس کے بعد اور بھی چڑھ گیا، کہ یہودیت و مسیحیت میں خدا جانے کیوں، عورت گناہ، پاپ، گندگی، نجاست اور آلودگی کے ہم معنی خیال کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بہشت کے پاک علاقے میں گندگی کا تخیل عیسائیوں کے لیے سخت دشوار تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن نے جب انسانی مساعی کے آخری غیر مختتم نتائج کی حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی نہ گھوڑا ہوتا ہے نہ بیل، نہ خدا، نہ فرشتہ بلکہ جو انسان ہے، وہ انسان ہی رہتا ہے، البتہ اسی کثیف انسان کو دوسری نشأت میں لطیف سے لطیف ترین درجات تک ارتقاء حاصل ہو جاتا ہے، اور درجات و احساسات کی اس ارتقائی لطافت کی مناسبت سے اُس کو وہ ساری نعمتیں قدرت اور اس کے قوانین کی طرف سے مہیا ہو جائیں گی، جنہیں لاکھوں برس سے انسان زمین کے اس کرّہ پر تلاش کر رہا ہے اور ابھی تک سرگرداں ہے۔

حور و قصور، جنّات و انہار والی یہی جنت تھی، جس کا ذکر جب یورپ میں پہنچا، تو پادریوں میں سخت شورش پھیلی، چونکہ اسلام انسان کی فطرت کو وہی دے رہا تھا، جو وہ مانگ رہی تھی اور مسیحیت اس کے مقابلہ میں انسان سے جنّت میں وہ سب چیزیں چھین رہی تھی، جن کی تکمیل کے لیے نسلِ آدم ہمیشہ بے تاب رہی، اور آج تک بیتاب ہے۔ آخر جزاء کی اس سزائی حقیقت کے ساتھ آدمی کب تک وابستہ رہ سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پادریوں نے حسبِ دستور پیشیناں لفظی تحریفوں اور تعبیری پیستروں سے کام لینا شروع کیا۔ لفظ تراشا گیا کہ قرآن کی جنّت حیوانی جنّت ہے۔ پادریوں کا یہ ایسا مغالطہ تھا کہ اس میں اچھے سے اچھے عقل و دانش والے اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھے اور مذہبی و غیر مذہبی ہر قسم کی کتابوں میں اس چست فقرہ کا اعادہ اتنے زور شور سے کیا گیا کہ خود مسلمانوں کی بھی ایک جماعت میں تزلزل پیدا ہوا، انہوں نے الفاظ کو معانی سے بے گانہ کرنا شروع کیا، اور اس درجہ بے گانہ کیا کہ قرآن میں صرف لفظی طور پر اسلامی جنّت باقی رہی، ورنہ معنوی طور پر اُن کے خیال میں بھی قرآن کا جنّتی اچھا خاصہ لنڈمنڈ بے حس عیسائی جنّتی بن کر رہ گیا، مولانا کو اس آنے والے فتنہ پر خاص طور پر تنبیہ ہوئی ہے اور خاص باب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آپ نے لکھا ہے۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں کتنے لطیف و عمیق پیرایہ میں اسلامی جنّت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> عقلاً جائز اور نقلاً واجب التسلیم ہے، کہ وہاں لذائذ روحانی اور جسمانی دونوں ایک ہی ہو جائیں اور ہرگز کسی طرح کی کشاکش اور تنازع ان میں باقی نہ رہے، اور جس طرح کمال لذت جسمانی ہو اُسی طرح عین اسی لذّت میں وہ کیفیت جو دنیا میں بڑے بڑے عارفوں کو کمال ترقی کے وقت حاصل ہوتی ہے، بوجہ احسن حاصل ہو، بلکہ اس سے مراتب زیادہ۔

لیکن بقول غالب

محرم نہیں ہے، تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کی نزاکتوں کا احساس ان کثیف و غبی فطرتوں کو کس طرح کرایا جا سکتا ہے، جنہوں نے انسانیت کے لطیف ترین حصّہ کو گندگی و نجاست کا سرچشمہ قرار دیا ہو، یا انسان سے انسانی جذبات و احساسات کی بربادی کو بجائے لعنت کے رحمت اور بجائے سزا کے جزاء خیال کر لیا ہو۔